مذہب کیا ہے؟

سوامی دویکانندجی کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ

از
دھرم سروپ صاحب بی۔ اے (آنرز)

دندناتے ہوئے قوی ہیکل دیو کی طرح ریل کا انجن چھکا چھک چھکا چھک لپکتا چلا آرہا ہے، دھرتی اس کے پاؤں تلے کانپ رہی ہے، ریل کی پٹری پر لرزہ طاری ہے اور دُور ایک رینگتا ہوا ناچیز کیڑا اس ارتعاش کو محسوس کرتا ہے اور اپنی محدود قوت کو پوری طرح کام میں لاکر پٹری کے اوپر سے سرک جاتا ہے، انجن بجلی کی سرعت سے گزر جاتا ہے لیکن کیڑے کو کچل نہیں پاتا۔ پٹری کے بازو سے لپٹی ہوئی یہ (سہمی ہوئی) ننھی سی جان پھر اپنے سکڑے ہوئے جسم کو ڈرتے ڈرتے پھیلا کر زمین پر اُتر آتی ہے، زندگی موت کی زد سے نکل کر پھر اپنی راہ پر چلنے لگتی ہے۔

سوچو تو اس ناچیز کیڑے اور ریل کے دیو صورت انجن میں کیا فرق ہے آخر اس چھوٹے سے کیڑے کی ہستی تو بس اتنی ہے کہ ایک لمحہ میں کچلی جا سکتی ہے مگر پھر بھی یہ ایک زندہ چیز ہے، اس میں جان ہے، اس کے برعکس انجن جسیم اور بھاری بھرکم ضرور ہے لیکن مُردہ مادہ ہے، بے جان ہے اس کی تمام طاقت تمام سینہ زوری تمام رفتار محض مشینی ہے، میکانکی ہے (اس لحاظ سے) ریل کی پٹری پر رینگنے والا ناچیز کیڑا جسے انجن کا ذرا سا لمس بھی جان سے مار سکتا تھا، انجن سے کہیں زیادہ عظیم ہے کیوں کہ (وہ لامحدود زندگی کا حصہ دار ہے) خود اس میں اپنی رفتار کو کم بیش کرنے کی طاقت ہے، انجن کو جس طرح ڈرائیور چلائے اسے ویسے ہی چلنا پڑتا ہے یہی فرق ہے جوہر زندہ میں۔ مشین میں طاقت ضرور ہے لیکن وہ بس وہی کام کر سکتی ہے جس کے لئے اُسے بنایا گیا ہے

اس کی میکانکی حرکت زندگی کی حرکت نہیں، زندگی کی حرکت میں آزادی اور شعور شامل ہیں، مُردہ مادّہ ہر صورت میں مجبور و محدود ہے، کیوں کہ اس کی نقل و حرکت میں آزادی اور شعور کو ہرگز دخل نہیں، زندگی آزادی اور خود مختاری کے مترادف ہے، یہی آزادی اور خود مختاری ہی ہمارا طرۂ امتیاز ہے، اور ہماری تمام زندگی دراصل ایسی آزادی اور خود مختاری کو حاصل کرنے کی متواتر اور مسلسل جد و جہد پر مشتمل ہے۔ ہم ہر لمحہ پہلے سے زیادہ آزاد ہونا چاہتے ہیں، ہماری تمام کوششوں اور کاوشوں کا مقصد ۔۔۔ زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کرنا ہی تو ہے، ہماری زندگی کا ہر قدم اِسی منزل کی طرف اُٹھتا ہے۔ زندگی کا کمال مکمل آزادی ہی میں مضمر ہے جب انسان ہر بندش سے آزاد ہو جاتا ہے تو اپنے کمال کو پالیتا ہے۔

ہمیں اس بات کا پوری طرح شعور اور احساس ہو یا نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاٹھ پوجا، بھجن اور کیرتن زہد اور تقویٰ، ترک اور ریاضت غرضیکہ عبادت اور پرستش کی ہر مروّجہ صورت کے پسِ پردہ حصولِ آزادی ہی کی خواہش اور کوشش کار فرما ہے۔ مثلاً ارتقا کی پہلی منزلوں میں انسان بھوت پریت کی پوجا کرتا ہے، اپنے آباؤ اجداد کی رُوحوں کی پرستش کرتا ہے، سانپ اور اژدہے کے آگے سر جُھکاتا ہے، اپنے قبائلی دیوی دیوتاؤں کی عبادت کرتا ہے۔ آخر کیوں؟ اسی لئے ناکہ وہ لاشعوری طور پر محسوس کرتا ہے کہ یہ ہستیاں اُس سے زیادہ بڑی ہیں، زیادہ طاقت ور ہیں اور اس کی آزادی کی راہ میں مُخل ہیں' وہ ان طاقتوں کو خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اسے تنگ نہ کریں، اُس کی خواہشات کی تکمیل کے راستے میں حائل نہ ہوں بلکہ اس حد تک مددگار رہوں کہ اُسے دنیا کی تمام نعمتیں محنت اور مشقت کئے بغیر ہی مل جائیں، دوسرے لفظوں میں انسان ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لئے ان طاقتوں سے جنھیں وہ اپنے سے بڑا سمجھتا ہے مدد طلب کرتا ہے یہی عبادت اور پرستش کی بنیاد ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو آدمی کی نظر ہمیشہ معجزات پر لگی رہی ہے، دنیا ہر وقت کسی نہ کسی معجزہ کی متوقع رہتی آئی ہے، ہم لاکھ کوشش کریں معجزے کی اُمید ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتی، مابعد الفطرت کا خیال ہم سے جُدا ہونے نہیں پاتا (بلکہ میں تو کہوں گا کہ) ہمارے دماغ کا وجود بذاتِ خود اسرارِ معنیٔ حیات کی تلاش کے لاانتہا سلسلے سے پیدا ہوا ہے، یہی ابدی جستجو مجسم اور مسلسل ہو کر انسانی دماغ بن گئی ہے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ

زیادہ تر غیر تربیت یافتہ لوگ ہی ما بعد الطبیعات کی طرف مائل ہوتے ہیں لیکن سوال تو یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ یہودی قوم ہمیشہ معجزے کی (دعا مانگ مانگ کر اس کا) انتظار کرتی رہی ہے بلکہ ہزارہا سال سے تمام دنیا اُس معجزے کی راہ تک رہی ہے جس سے ہماری زندگی جنت کی زندگی میں مبدل ہوجائے بہر حال اس کا تو سب کو اعتراف ہے کہ ہر شخص دنیا سے نالاں ہے کسی کو تسلی نہیں، چاروں طرف بے چینی اور ناشکیبائی ہے، ہم اپنی حالت پر راضی نہیں ہیں ہم آئے دن اپنے لئے ایک نیا نصب العین تیار کرتے ہیں، اور ابھی اس کی تحصیل کے لئے چند قدم ہی چلنے پاتے ہیں کہ ایک اور بلند تر آدرش تخلیق کر لیتے ہیں، ہم کسی خاص چیز (مقام یا مرتبہ) کو حاصل کرنے کا تہیہ کر کے اس کے لئے لگاتار سخت کوشش کرتے ہیں لیکن ہمیں جلد ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ ہماری مطلوبہ چیز ہماری ضرورت کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ اس سے ہماری تسلی نہیں ہوتی، بس بے چینی اور مایوسی ہے کہ ہر وقت دل پر چھائی رہتی ہے، آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اگر ہمارے نصیب میں انتشار اور بے قراری ہی لکھی ہے، اگر ہماری قسمت میں پریشانی ہی ہے تو ہمارے دماغ کو کیوں کسی غیر معلوم حقیقت کی تلاش ہے؟ ہمارے دل و دماغ کی خود اپنی حقیقت کیا ہے،؟ اس جہانگیر بے چینی اور بے قراری کے معنیٰ کیا ہیں؟ اس کی وضاحت بس یوں ہی ہوسکتی ہے کہ انسان کی منزل مکمل آزادی ہے اور وہ ہر گھڑی زیادہ سے زیادہ آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہے (جنم سے مرن تک) انسان کی تمام زندگی اس کش مکش، اس جدو جہد میں مبتلا ہے۔ بچّہ پیدا ہوتے ہی قوانینِ زندگی کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ اس کے گلے سے پہلی آواز ایک چیخ کی صورت میں نکلتی ہے جیسے کہ وہ زندگی کی غلامانہ بندشوں کے خلاف بغاوت کر رہا ہو، یہ احساسِ حبس جو انسان اپنے ساتھ لے کر دنیا میں آتا ہے، آزادی کی آرزو کو جنم دیتا ہے اور آزادی کی (زبردست) خواہش سے ہی ہمارے دل و دماغ میں ایک ایسی ہستی کا تصور پیدا ہوتا ہے جو آزادِ مطلق ہے، خدا کا تصور ہماری سرشت میں داخل ہے، یہ تصور ہمارے وجود کا بنیادی عنصر ہے، ویدانت نے مکمل آزادی کے اس تصور کو ست چت[1] آنند کا نام دیا ہے، جس کے معنی ہیں ہستی، شعور و مسرت، ویدانت میں [illegible] تصور وہ ہستی ہے، جس میں وجود، شعور و نشاط بیک وقت کمال پر پہنچ گئے ہوں،

---

[1] SAT-CHIT-ANAND. (EXISTENCE [illegible] BLISS.

بلکہ ہستی، شعور اور نشاط ہی کے کمال کا نام خدا ہے، آگہی (گیان) کا عطر اور نشاط کا ست ہی خدا ہے۔ خدا ہماری زندگی کا مقصد ہے، ہم مدتوں اپنے دل کی اندرونی آواز کو دباتے رہے ہیں، ہماری کوشش یہی رہی ہے کہ قوانینِ قدرت کے مطابق زندگی بسر کریں لیکن ہماری فطرت میں کوئی چیز ایسی ہے جو ہمیں قدرت کے بظاہر اٹل قانونوں کے خلاف سر اُٹھانے پر مجبور کرتی ہے۔ بغاوت، ہماری فطرت کا تقاضہ ہے، ہم اس بات کو پوری طرح سمجھیں یا نہیں، اپنی اس فطری خاصیت کے معنی کو پائیں یا نہیں لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہمارے اندر ایک مسلسل کشمکش جاری ہے، یہ کشمکش عموماً غیر شعوری طور پر ہوتی رہتی ہے لیکن وقتاً فوقتاً یہ کشمکش شعور کی سطح پر بھی نمودار ہو جاتی ہے، ہمارے روحانی رجحانات اور جسمانی مطالبات کے درمیان یا یوں کہو کہ ہمارے دماغ اور نفس کے درمیان یا دماغ کے اعلیٰ اور ادنیٰ حصوں کے درمیان ہمیشہ یہ کش مکش جاری رہتی ہے ایک چیز ہمیں محدود و محبوس رکھنے میں کوشاں ہے، تو دوسری آزاد ہونے کے لئے بیتاب ہے، اسی کشمکش سے ہماری انفرادی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے جہاں مکمل آزادی ہے وہاں انفرادیت کا تصور ہی پیدا نہیں ہوتا اس طرح جہاں قدرت کی مکمل غلامی ہے وہاں مُردہ مادّے کا وجود ہوتا ہے زندگی کا ظہور نہیں ہوتا،

زندگی بذاتِ خود احساسِ حبس کے خلاف بغاوت ہے، یہ جو تقریباً ہر مذہب میں جہنّم کا تصور ملتا ہے اس عظیم حقیقت کا ثبوت ہے کہ ہم پیدائشی باغی ہیں، ہم قوانین کی بندشوں کو قبول کرنے سے ہمیشہ انکار کرتے چلے آئے ہیں، پیدائش کے وقت بھی ہم چلاّ چلاّ کر کہتے ہیں" ہائے یہ بندھن کیسا؟ یہ قانون کیوں؟" جب تک ہم قدرت کے قوانین کی پوری طرح پیروی کرتے ہیں، ہماری ہستی مشینوں کے وجود سے بہتر نہیں ہوتی، کائنات کا کاروبار چلتا رہتا ہے اور اس میں میکانکی طور پر ہم بھی شامل ہوتے ہیں لیکن ہم میں اس چکّر سے باہر نکلنے کی طاقت نہیں ہوتی، ہماری فطرت قوانینِ قدرت کا عکس ہو کر رہ جاتی ہے، ہماری روحانی زندگی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب ہم اس میکانکی درجے سے اوپر اُٹھ کر محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اندر کوئی ایسی طاقت ہے جو قوانینِ قدرت کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہونا چاہتی ہے۔ یہ انسانی زندگی کے ارتقاء کا پہلا قدم ہے، ہماری روح آزادی کا نعرہ لگاتی ہے۔ " آزادی آزادی مطلق اور مکمل آزادی"

کی صدا درونِ قلب سے اٹھتی ہے لیکن صد حیف کہ اس مقام پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قوانینِ قدرت نے ہمیں پوری طرح جکڑ رکھا ہے اور غلامی ہی ہمارے حصہ میں آئی ہے۔

مجبوری کا یہ احساس ہمیں خارجی امداد کی تلاش کے لئے متحرک کرتا ہے، ورنہ یہ سانپ اور اژدہے (یا جن اور بھوت) کی پوجا کے کیا معنی؟ یہ معجزوں کی جستجو کے مختلف طور وطریق کا کیا مطلب؟ آخر ہم کیوں کہتے ہیں کہ ایک چیز میں جان ہے اور دوسری میں نہیں؟ اس تلاش، اس جستجو، اس جدوجہد کا آخر کچھ تو مطلب ہونا چاہیئے۔ یہ کش مکش، یہ سعیٔ مسلسل، بے معنی اور فضول تو نہیں ہوسکتی، یہ سب کرشمے ہیں انسان کی تلاشِ آزادی کے، لیکن ہم ابھی تک یہ نہیں سمجھ پائے کہ قوانینِ قدرت کے دائرے میں آزادی ناممکن ہے یہاں تو اٹل قانون ہے اور بس ستاروں سے ذروں تک سب قانونِ قدرت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور قدرت کی تمام وسعتیں انسان کی آزادی کو محدود کرنے کی حدیں ہیں، تمام عالمِ کائنات میں انسان کے لئے آزادی ناممکن ہے لیکن ہمیں اس تلخ حقیقت کا یقین نہیں آتا۔ خارجی علم جسے ہم آج کل سائنس کے نام سے موسوم کرتے ہیں، ہزارہا سال سے اس کوشش میں ہے کہ قدرت پر قابو حاصل کرکے آزادی حاصل کرلی جائے لیکن ایک قانون سے گزر کر اُس سے زیادہ ہمہ گیر قانون سے پالا پڑ جاتا ہے، پھر بھی ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ قدرت کی چار دیواری میں حصولِ آزادی ناممکن ہے

ہم ابتدائے زمانہ سے قوانینِ قدرت کا مطالعہ کرتے آرہے ہیں، لیکن اس بات کو ہرگز تسلیم نہیں کرنا چاہتے کہ خود انسان انہیں قوانین کا پابند ہے، ہماری روح بار بار آزادی کی رٹ لگائے جاتی ہے جب سے انسان نے خدا کی آزاد مطلق ہستی کا تصور پایا ہے۔ وہ قدرت کی دوامی غلامی کو قبول کرنے کے لئے کسی صورت بھی راضی نہیں ہوتا، بندشوں میں گھر کر بھی انسان بندشوں کا قائل نہیں ہوتا، وہ کہتا ہے "میں جانتا ہوں کہ میں جنم سے غلام ہوں مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ قدرت نے مجھے ہر طرف سے جکڑ رکھا ہے میری مشکیں کس رکھی ہیں لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ایک ایسی ہستی بھی ہے جو قدرت کے ہر قانون سے بالا ہے جو آزاد مطلق ہے جو خود قدرت کا آقا اور حاکم ہے جس کے اشارے پر قدرت ناچتی ہے میں غلام بھی ہوں پر اس ہستی کو پاکر آزاد ہوسکتا ہوں"

ظاہر ہے کہ آزادیٔ مطلق یعنی خدا کا تصور انسانی دماغ کا اتنا ہی اہم اور بنیادی جزو ہے جتنا کہ فطرت کی مجبوری اور غلامی کا خیال، اگر جبر ایک حقیقت ہے تو اختیار کا ہونا بھی لازم ہے، اگر انسان مجبور ہے تو اُس کا خدا مختارِ کل ہے، سچ تو یہ ہے کہ فطرت کی مجبوری اور خدا کے اختیار کے تصور دراصل دونوں اس ایک حقیقت کے دو رُخ ہیں جسے ہم آزادیٔ مطلق کہہ سکتے ہیں، آزادی کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ آزادی کے احساس کے بغیر کوئی پودا تک اُگ نہیں سکتا، کوئی کیڑا رینگ نہیں سکتا، فرق صرف اتنا ہے کہ پودے یا کیڑے میں زندگی کو ابھی انفرادی شخصیت کے درجہ تک اُٹھنا ہوتا ہے، لیکن آزادی کا احساس غیر شعوری طور پر اِن میں بھی کارفرما ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پودا قدرت کا غلام نہیں بلکہ اپنی خاص صورت اور اپنی مخصوص قسم کے تحفظ کے لئے زندہ رہتا ہے۔ یہی حال زندگی کی دوسری صورتوں کا ہے،

جبر اور اختیار کی کش مکش ہر جگہ اور ہر وقت جاری ہے، بظاہر ہر قدم پر آزاد روی قوانینِ قدرت کی پابند معلوم دیتی ہے، لیکن جتنا ہی مادی دنیا کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے اُتنا ہی ان وسیع بندشوں سے نکلنے کا خیال بھی تقویت پکڑتا جاتا ہے، جیسے ہمارا علمِ مادیات بڑھتا ہے اور ہم قوانینِ قدرت کی عالمگیری سے واقف ہوتے ہیں ویسے ہی اِن ہمہ گیر قوانین سے بالا اور آزاد حالت کا تصور بھی زیادہ کشادہ اور مضبوط ہوتا جاتا ہے، اور اس طرح جبر اور اختیار کی یہ مسلسل جنگ جاری رہتی ہے (یہ جنگ) کبھی ایک صورت اختیار کر لیتی ہے کبھی دوسری شکل میں نمودار ہوتی ہے، وقت اور مقام کے لحاظ سے اور انسانی ارتقاء کے مطابق مختلف مذہب اور مسلک ظہور میں آتے ہیں اور نئے نئے اعتقاد والے فرقے پیدا ہوتے ہیں، صوری اختلافات کی وجہ سے یہ فرقے آپس میں برسرِ پیکار نظر آتے ہیں، بہت حد تک جبر اور اختیار کے تصادم کی یہ صورتیں ناگزیر ہیں، جبر کی حدیں بڑھیں گی تو آزادی بھی ان حدوں کو عبور کرنے کے لئے اور زیادہ مکمل صورت اختیار کرے گی۔ اگر ہم اس بات کو ذہن نشین کر لیں تو پھر "جنگِ ہفتاد و دو ملت" بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ کیوں کہ ہم سمجھ جاتے ہیں کہ ہم سب ایک ہی منزل یعنی مکمل آزادی کی طرف گامزن ہیں۔

اسی مکمل آزادی کے تصور ہی کو مجسم کر کے ہم قادرِ مطلق یا خدا کہتے ہیں، خدا کی ہستی سے انکار ناممکن ہے آزادی کے خیال کے بغیر زندگی ناممکن ہے، اسی خیال کے سہارے ہی تو ہم جیتے ہیں، اس کا ترک کیونکر ممکن ہو سکتا ہے، مثلاً اگر آپ کو اپنی آزادی اور خود مختاری کا پورا یقین نہ ہوتا تو کیا آپ میرا لیکچر سننے کے لئے یہاں آتے؟ آپ میں سے کون ہے جو یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ یہاں اپنی خوشی اور مرضی سے آیا ہے؟ کون ہے جسے قدرت کے اٹل قوانین کے باوجود اپنی آزادی اور اپنے اختیار کا احساس نہیں، یہی احساس تو ایمان ہے یہی خدا کی ہستی کا اقرار، ممکن ہے کہ کسی نہ کسی وقت حیاتیات کی سائنس، یعنی بائیالوجی (Biology) اِس احساسِ اختیار کی وضاحت مہیا کر دے، آزادی کی اس دائمی جد وجہد کی تشریح کر دے لیکن یہ سب کچھ مان بھی لیا جائے تو بھی مکمل آزادی کا تصور بجائے خود قائم رہتا ہے۔ یہ خیال تو کسی صورت نہیں مٹنے پاتا جیسے کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں (اختیار و آزادی کے) اس تصور کی اتنی ہی حقیقت ہے جتنی قوانینِ قدرت کے سامنے ہماری مجبوریوں کی،

غلامی اور آزادی، روشنی اور اندھیرے، نیکی اور بدی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر غلامی اور مجبوری کی کوئی حقیقت ہے تو آزادی اور اختیار کی حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مانا کہ انسانی ارتقاء کے مطالعہ سے بیشتر یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو اپنی مجبوریوں کا زیادہ احساس رہا ہے لیکن آزادی اور اختیار کا تصور بھی ضرور رہا ہوگا، آج ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اوائلِ تاریخ کے انسان کا احساسِ مجبوری حصولِ آزادی کی جد وجہد کی ایک صورت تھی، لیکن یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ آزادی اور اختیار کے خیال نے جنم ہی نہیں لیا تھا، (ہم دیکھتے ہیں کہ) غیر مہذب انسان کے ضمیر میں ناپاکیزگی اور گناہ کا خیال بہت کم ہوتا ہے کیوں کہ ارتقاء کے اس مقام پر اس کا درجہ جانوروں سے کچھ ہی اونچا ہوتا ہے اس لئے اسے گناہ کی مجبوری کا احساس نہیں ہوتا، وہ تو مادی مجبوریوں کے خلاف جد و جہد کرتا ہے اس کی ساری کوششیں اپنی جسمانی ضروریات کو پورا کرنے میں صرف ہوتی ہیں لیکن انسانی شعور کے اس پست مقام سے ہی آہستہ آہستہ دماغی محدودیت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور بڑھتے بڑھتے روحانی آزادی کی زبردست خواہش میں مبدل ہو جاتا ہے، شروع شروع میں تو یہ خواہش آنجہانی کے

موٹے موٹے پردوں کے پیچھے بالکل نظر ہی نہیں آتی لیکن جوں جوں جہالت کم ہوتی جاتی ہے، اس نورِ ازلی کی کرنیں چھن چھن کر آنے لگتی ہیں، اور حقیقت تو یہ ہے کہ آزادی اور کمال کا یہ لازوال مجسمہ جسے انسان نے شہنشاہِ عالم کا نام دے رکھا ہے ہمیشہ اور ہر وقت اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ ریز ہے، جس کو جتنی تابِ دید ہوتی ہے اس سے فیض یاب ہوتا ہے، فرق صرف درجے کا ہوتا ہے نوعیت کا نہیں ہوتا۔

اس نقطۂ نظر سے تمام عالم ایک عبادت گاہ ہے اور قدرت کی ہر جنبش و حرکت خدا کی پرستش کی ایک صورت ہے، جہاں کہیں زندگی جلوہ گر ہوتی ہے، آزادی اور اختیار کی تلاش ساتھ لئے ہوتی ہے، اور چونکہ مکمل آزادی اور اختیارِ کل کا نام ہی خدائی ہے اس لئے آزادی کی جستجو خدا کی تلاش ہے، خدا کی عبادت ہے اور حصولِ آزادی وصلِ الٰہی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مکمل آزادی ملتے ہی ہمیں قدرت پر پورا اختیار حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ آزادی علم اور آگہی کے بغیر ناممکن ہے، ہم جانتے ہیں کہ جتنا وسیع ہمارا علم ہوتا چلا جاتا ہے اتنی ہی زیادہ قدرت ہمیں فطرت پر حاصل ہوتی جاتی ہے۔ اور اس اختیار اور قدرت کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی طاقت کا احساس ہوتا چلا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اگر کوئی ہستی ایسی ہے جو قادرِ کل ہے جو آزادِ مطلق ہے تو اس ہستی کا علم بھی مکمل ہوگا۔ اسے قدرت سے پوری طرح واقفیت ہوگی۔ یعنی وہ ہستی حاضر و ناظر ہوگی، دانائے کل ہوگی، آزادی اور قدرت (اختیار) کو معرفت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، یہ دونوں ایک ساتھ ہوتی ہیں، وہ وہی ہستی قوانینِ قدرت سے بالا ہو سکتی ہے اور کامل کہلا سکتی ہے جس میں پوری آزادی اور قدرت کے ساتھ ساتھ علم اور معرفت بھی بدرجۂ اتم موجود ہو،

اس کے علاوہ کامل ہستی کے اعلیٰ ترین تصور میں برکت اور دائمی اطمینانِ قلب (شانتی) شامل ہے حق تو یہ ہے کہ مذہب کا بلند ترین تصور اس برکت اور شانتی کا تصور ہے جو مکمل آزادی سے پیدا ہوتی ہے خصوصاً ویدانت میں تو بھگوان کے متعلق تمام خیالات کی اصل وہ آزادِ مطلق ہستی ہے جو کسی چیز کی پابند نہیں، جس میں کوئی تغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتا، جو قوانینِ قدرت سے بالا ہے، بلکہ قدرت خود اس ہستی میں شامل ہے۔ جو ہمیشہ یکساں ہے، ساتھ ہی ویدانت یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ یہ مکمل آزادی آپ کی اور میری ہم سب کی اصل ہے، اسی کو پانا ہی سچی نجات ہے، باقی سب غلامی ہے۔

مشکل یہ ہے کہ ہم سب یہ تو مانتے ہیں کہ خدا کی عظیم الشان ہستی ہمیشہ قائم ہے، بس ایک اُسی کو ثبات ہے، لیکن جب ہم اُسے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں، جب ہم آزادی حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں تو ہم (اپنی جد و جہد کو) قدرت کی خارجی سطح پر ہی محدود کر لیتے ہیں اپنی روزمرہ کی زندگی کی معمولی باتوں پر اپنی ساری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ ہم دولت کمانے، جاہ و مرتبہ پانے اور کسی کی محبت حاصل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں اور اسی میں اپنی کامیابی سمجھتے ہیں، ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ چیزیں غلامی کی زنجیریں ہیں ان کے حاصل کرنے سے آزادی نہیں ملتی بلکہ ان سے غلامی کو تقویت پہونچتی ہے، تغیر پذیر اور فانی چیزیں ہمیں اپنی اصل سے اور دور لے جاتی ہیں، آخر قدرت کی درخشندگی کی اصل کیا ہے؟ وہ کیا شے ہے جو قدرت ہر روز بدلتی ہوئی صورتوں میں متواتر درخشاں ہے؟ دنیا سورج یا چاند یا ستاروں کی روشنی سے زندہ نہیں، زندگی کی چمک، قدرت کا حسن و جمال، عالم کائنات کی تابانی سب اسی ازلی اور ابدی نور سے پیدا ہیں۔ جسے ہم خدا یا بھگوان کہتے ہیں، دنیا میں جہاں کہیں بھی نور کی کرنیں نظر آتی ہیں سب اسی کا عکس ہیں، سورج کی تاب و تپش بھی اسی سے ہے اور ہمارے ضمیر کی چشم افروز روشنی بھی وہی ہے۔ وہی ہے جو ہر طرف نور پاش ہے اسی کے نور سے سب چیزیں روشن ہیں۔

تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خدا اپنا ثبوت آپ ہے، خود درخشاں ہے، حاضر و ناظر ہے۔ دانائے کل ہے، آزاد مطلق ہے، تمام فطرت کا آقا و مالک ہے، شہنشاہ عالم ہے۔ ہم اس بات کو سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن دنیا میں جہاں کہیں بھی اور جیسے بھی پوجا ہوتی ہے سب اُسی ہی کی عبادت اور پرستش ہے، وہی ہم سب کے سجدوں کی آستان ہے[1] بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ جس چیز نے ہم سب کو حیران اور پریشان کر رکھا ہے۔ اور جسے ہم بدی اور شیطنت کے نام سے پکارتے ہیں، وہ بھی خدا ہی کی پرستش کی ایک صورت ہے[2] اگر خدا مکمل آزادی کا نام ہے تو اس آزادی کو حاصل

---

[1] ہمہ کس طالب یار اند چہ ہشیار چہ مست ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

[2] میخوارہ و سرگشتہ و رندیم و نظر باز وانکس کہ چو ما نیست دریں شہر کدام است
با محتسبم عیب مگوئید کہ او نیز پیوستہ چو ما در طلب عیش مدام است

کرنے کی ہر کوشش اس کی پوجا ہے۔ اگر اس کی صورت بگڑی ہوئی ہے تو کیا اس کی نوعیت تو دوسری نہیں، آپ کو میری بات سے خوف تو ضرور آئے گا لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ گناہ اور ثواب، خیر و شر، آزادی حاصل کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ وہی آزادی کی خواہش ہے جو ایک آدمی کو نیک اعمال کی طرف مائل کرتی ہے اور دوسرے کو بُرے کاموں کی ترغیب دیتی ہے۔ میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ دوسری حالت میں آزادی کی خواہش غلط رستے پر چل نکلی ہے لیکن اس حقیقت سے کیونکر انکار ہو سکتا ہے کہ قوت تحریک دونوں حالتوں میں ایک ہے، اور وہ ہے بندشوں سے نکل کر آزاد ہونے کی خواہش[1] آزادی کی یہ تمنا عالم کائنات کے ذرے ذرے میں موجود ہے، زندگی کی ہر دھڑکن کی محرک آزادی ہے[2]۔ حیاتِ عالم کے وجود میں بس یہی واحد دل دھڑک رہا ہے، اسی کی نسبت سے ہی اعضائے زندگی کی کثرت سمجھ میں آتی ہے،

یہ ہے خدائے ذوالجلال کا وہ عظیم تصور جو ہمیں اُپنشدوں میں ملتا ہے۔ لیکن اپنشد یہیں رک نہیں جاتے، وہ ہمیں یہاں سے بھی آگے اُس مقام پر لے جاتے ہیں جہاں اول اول ہم حیران و ششدر رہ جاتے ہیں، اُپنشد کہتے ہیں کہ ہماری اصل اور خدا درحقیقت ایک ہیں، بندہ اور خدا اصل میں دو[2] نہیں بلکہ ایک ہی ہستی ہیں، وہی ہستی جو تتلی کے خوبصورت پروں میں اور گلاب دل کش کے غنچوں میں رنگ بن کر جلوہ گر ہوتی ہے، اُسی کے دم سے تتلی پرواز کرتی ہے اور غنچہ کھلتا ہے، وہی خالق جو ہمیں زندگی بخشتا ہے، خود ہمارے اندر ہماری قوتِ محرکہ بن کر رہتا ہے، اسی (کے پیار کی) گرمی سے حیات

---

[1] نیک سیرت آدمی دل کی کشادگی اور نظر کی وسعتوں میں آزادی محسوس کرتا ہے اور اپنی محبت کے دائرے کو متواتر وسیع تر کرنے کی کوشش کرتا ہے، برعکس اس کے شیطان سیرت آدمی تمام دنیا کو اپنے بس میں لانا چاہتا ہے وہ اسے سمیٹ کر اپنی محدود ہستی میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ اس کے ہر کام میں خود غرضی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہم اسے بجا طور بد اعمال کہتے ہیں۔

[2] روشن از پرتو رویت نظرے نیست کہ نیست ۔۔۔ منتِ خاکِ درت بر بصرے نیست کہ نیست
ناظرِ روئے تو صاحب نظرانند آرے ۔۔۔ سرِ گیسوئے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

رونما ہوتی ہے اور اُسی کی سرد مہری سے کڑی سے کڑی موت واقع ہوتی ہے، زندگی اور موت اسی کی قدرت کے کرشمے ہیں، زندگی جاوداں اُس کا عکس منور ہے، اور موت اُسی کی کالی پرچھائیں، اگر ہمیں اپنشدوں کے خدا کے ہمہ گیر تصور کو سمجھنا ہے تو اُس کی دونوں صورتوں کو قبول کرنا ہوگا، ہم عام طور پر دنیا کی خوفناک چیزوں سے اس طرح دُور بھاگتے ہیں جیسے خرگوش شکاری کتّوں کو دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور افسوس کی بات تو یہ ہے کہ خرگوش کی طرح سر چھپا کر ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ خطرے سے بچ گئے حالانکہ اس طرح کی خود فریبی سے ہماری موت اور بھی یقینی ہوجاتی ہے۔ تمام دنیا خوفناک چیزوں کے آگے بھاگ رہی ہے اور آخر یہ دہشتناک چیزیں اسے دبوچ لیتی ہیں۔ خطرے کا مقابلہ اس طرح کبھی نہیں ہوسکتا اس سلسلے میں میں آپ کو اپنی زندگی کا ایک واقعہ سناتا ہوں، ایک دفعہ میں بنارس شہر کے ایک ایسے حصے سے گزر رہا تھا جہاں ایک طرف تو (بڑا بھاری) تالاب تھا اور دوسری طرف ایک بہت اونچی دیوار تھی اس علاقے میں بے شمار بندر رہتے تھے، شاید آپ جانتے ہیں کہ بنارس کے بندر کافی بڑے ہوتے ہیں، اور اشتعال میں آجائیں تو مسافروں کے لئے وبالِ جان بن جاتے ہیں، بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب میں تالاب کے پاس سے گزرنے لگا تو انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ مجھے اپنی گلی سے نہیں جانے دیں گے وہ کے گروہ میرے گرد آکر چیخنے اور شور مچانے لگے یہاں تک کہ وہ میرے اس قدر نزدیک آگئے کہ میرے پاؤں پر جھپٹ مارنے لگے، یہ دیکھ کر میں نے وہاں سے بھاگنے کی ٹھانی، لیکن میں جو بھاگنے لگا تو بندروں نے میرا تعاقب کرنا شروع کردیا۔ جتنا تیز میں بھاگتا اُتنا ہی تیزی سے وہ میرے پیچھے دوڑتے آتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ دانت نکال کر کاٹنے کو آگئے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جان بچ نہیں پائے گی۔ عین اس وقت ایک اجنبی وہاں آن گزرا، اس نے مجھے پکارا اور کہا "بھاگو مت ان وحشیوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہوجاؤ" چنانچہ میں فوراً رُک گیا اور مُڑ کر بندروں کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ تا ناتا بندر بھی رُک گئے اور آخر ایک ایک کر کے سب وہاں سے چلے گئے، دنیا میں کامیاب زندگی کرنے کا یہی راز ہے، خوفناک اور دہشتناک چیزوں کا دلیری سے ڈٹ کر مقابلہ کرو، زندگی کی مشکلات بندروں کے [illegible] کی طرح بھاگ جاتی ہیں اور ہمیں ان کے آگے بھاگنے کی ضرورت نہیں رہتی، اگر ہمیں آزادی